© rasailojaraid.com

پروفیسر اسلم انصاری

خطیبِ عصر کمالِ خطابت کے آئینے میں

عذرِ جسارت

برصغیر سے انگریزی استعمار کا رخصت ہونا آسان کام نہیں تھا۔ اس عفریت نے سترہویں صدی میں برصغیر کے جسد میں اپنے پنجے گاڑے اور اٹھارویں صدی کے وسط تک اپنے سیاسی اور تہذیبی تسلط کو تکمیل تک پہنچا دیا۔ بیسویں صدی جو برصغیر کی سیاسی بیداری کی صدی تھی، گزشتہ صدی کی طرح مسلمانوں کے لئے بہت سی کڑی آزمائشیں لے کر آئی۔ یہ ایک طرف فکر و نظر اور فہم و فراست کی امتحان گاہ تھی، تو دوسری طرف ذوقِ عمل کی مبارز طلبی بھی تھی۔ یہ اگر ایک سطح پر آئینی حقوق کے حصول کی جنگ تھی تو دوسری سطح پر قید و بند، تعزیر و زنجیر اور طوق و سلاسل کی جھنکاروں کا سفر بھی تھا۔ اس سفر میں جن لوگوں کے چہرے حریف وقت کی تابنا کئ شمشیر سے گلگوں رہتے تھے ان میں خطیب عصر حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اور ان کے فکر و عمل کے درخشندہ پہلو ہماری ملی تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔ ان کا سفر تحریک خلافت سے شروع ہوا اور راستے میں تحریک کشمیر جیسے کئی صبر آزما اور جاں طلب پڑاؤ آئے۔ ان کی حریت پسندی کا بانکپن ہر مرحلۂ سفر میں دلآویز، عشق انگیز بلکہ جنوں خیز ثابت ہوا۔ حریت پسندی اور عشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو انہوں نے زندگی کا بنیادی رویہ بنانے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ ان کی خطابت نے دلوں کے تاروں کو نہ صرف چھو لیا بلکہ تار تار کو سازِ حدی خواں بنا دیا۔ ان کی وجاہت عملی اور جلالت فکر و عمل نے عوام الناس کے دلوں میں ان جانے جذبوں کے چراغ روشن کئے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک ایسے فصاحت مآب خطیب بن کر اُبھرے اور دنیا کی نظروں میں سمائے جس کے آہنگ خطابت نے حرف و معنی کی ایک یکسر نئی دنیا آباد کر ڈالی۔ مجھے اپنے زمانۂ طالب علمی میں چند بار ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت میسر آئی اور ہر بار ان کی شخصی عظمت کا نقش میرے دل میں گہرا ہوتا گیا۔ بعد کے سالوں میں مجھے ان کے فرزندانِ گرامی سے نیاز حاصل ہوا۔ اور "الولد سر لابیہ" کی حقیقت آشکار ہوئی۔ بالخصوص مولانا سید عطاء المحسن بخاری اور مولانا سید عطاء المومن بخاری کی انسان دوستی اور دوست نوازی نے ہمیشہ میری قدر افزائی کی۔ آج سے چند برس پیشتر سید عطاء المحسن بخاری نے شاہ صاحب علیہ الرحمہ کی یاد میں منعقد کی جانے والی ایک تقریب میں مجھے اظہارِ خیال کا حکم دیا۔ اپنی حدود کو جاننے کے باوصف میرے لئے امتثالِ امر کے سوا چارہ کار نہ تھا۔ ذیل کی یہ سطور اسی "اظہار خیال" کا حاصل ہیں جو کم ارزش ہونے کے باوجود حضرت ابنِ امیر شریعت کی محبت اور توجہ کی بدولت منضبط ہو گئیں اور محفوظ رہیں۔ اب انہیں کے ایماء پر میں نے ان پر نظرِ ثانی کی ہے۔ یہ جو کچھ ہے اسے اس بطلِ حریت اور خطیب عصر کے حضور ایک طالب علم کا نذرانۂ عقیدت خیال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنا چاہیئے اور اس کا مطالعہ اسی نقطۂ نظر سے کرنا چاہیئے۔ یہی میرا عذرِ جسارت ہے۔ اور عذر کے بارے میں اہلِ عرب کا قول فیصل ہے۔ "والعذر عندالکرام مقبول"

ارفعیت: ایک آہنگ

محترم سامعین!

یہ امر میرے لئے صد گونہ باعث حیرت ہے کہ میں آج کی تقریب میں کیا کہوں۔ میں مقرر بھی نہیں، خطیب بھی نہیں، خوش بیاں بھی نہیں، اہل زباں بھی نہیں، لیکن ابن امیر شریعت حضرت سید عطاء المحسن بخاری کو مجھ سے حسنِ ظن ہے اور اس حسنِ ظن کے نتیجے میں میں حاضر ہوا ہوں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ یہ اسٹیج مجلس احرار اسلام کا اسٹیج ہے جس کے بارے میں ارشد ملتانی صاحب نے صحیح فرمایا ہے کہ یہ شہسواران خطابت کا اسٹیج ہے۔ آج سے نہیں نصف صدی سے اور اس سے بھی پہلے سے یہ واقعی شہسوارانِ خطابت کا اسٹیج رہا ہے۔ جس کی مثال برصغیر کی علمی، ادبی، تہذیبی ثقافتی زندگی میں کم ہی ملے گی۔ پھر موضوع حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہیں جن کی خطابت بے مثال ہے۔ جن کی شخصیت جامعِ کمالات ہے اور جن کی یاد آج بھی دلوں میں جاگزیں ہے۔ میں نے بہت کم دیکھا شاہ صاحب کو مگر دیکھا ہے۔ میں نے ان کے خطاب کو بہت کم سنا مگر سنا ہے۔ مجھے ان کی صحبت سے فیض اٹھانے کا بہت کم موقعہ ملا مگر ملا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج میں جرأت کر رہا ہوں کہ چند باتیں خراجِ عقیدت کے طور پر آپ حضرات کے سامنے عرض کروں۔ جن لوگوں نے شاہ صاحب کو سنا ہے، ان سے ملے ہیں، ان سے فیض صحبت اٹھایا ہے وہ حیران ہوتے ہیں کہ ان لوگوں کو کیا بتائیں؟ جنہوں نے ان کو نہیں سنا یا جو ان سے نہیں ملے۔ کن لفظوں میں بتائیں؟ کس پہلو کو لیں؟ کس کس بات کا تذکرہ کریں؟ الفاظ میں وہ شان و شوکت، وہ عظمت، وہ طنطنہ، وہ گونج، وہ نغمگی کہاں سے لائیں جو قدرت نے جو مبدأ فیاض نے شاہ صاحب کو عطا فرمائی تھی۔

کیا معاصرین میں کوئی ایسی شخصیت ہے؟ کہ جس سے مشابہت دے کر سمجھایا جا سکے کہ شاہ صاحب ایسے تھے۔ جو لوگ شاہ صاحب سے ملے ہیں اور انہوں نے ان کو سنا ہے وہ لوگ حیران ہیں اور جن لوگوں نے نہیں دیکھا نہیں سنا ان کو دیکھ کر حیران ہوتے ہیں کہ آخر یہ کس نادرِ روزگار شخصیت کا تذکرہ ہے۔ شاہ صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں۔ جن کا ابھی تذکرہ ہوا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ احاطہ نہیں ہو سکتا۔ میری ایک مشکل یہ بھی ہے کہ میں بہت کم شاہ صاحب کو مل سکا، بہت کم سن سکا، بہت کم استفادہ کر سکا، ایسی یادیں بھی نہیں جن کو تفصیل کے ساتھ بیان کروں۔ لیکن ادب کا طالب علم ہونے کی حیثیت سے میرا ایک موضوع، ابلاغ بھی ہے۔ ابلاغ کا مطلب ہے اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانا، تبلیغ اسی سے ہے۔ انگریزی میں اسے کمیونیکیشن (COMMUNICATION) کہتے ہیں۔ ایک بات دفعِ دخلِ مقدر کے طور پر کہنا چاہتا ہوں۔ یہاں علماء کرام بھی موجود ہیں۔ مشرقی علوم اور ادبیات کے فضلاء بھی یہاں تشریف فرما ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک بات بطور اعتذار کے عرض کرنا چاہتا ہوں۔۔۔۔ گفتگو میں اگر کچھ اجنبیت محسوس ہو تو اسے تھوڑی دیر کے لئے گوارا فرمایئے۔ مجھے آپ کے حسنِ سماعت پر پورا یقین ہے کہ آپ میری کج مج بیانی کو بھی موضوع کے احترام میں اعتبارِ کلام بخشیں گے۔ ابلاغ کا مطلب ہے اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانا، انگریزی میں اسے کہتے ہیں کمیونیکیشن! یہ اس زبان کا لفظ ہے جس سے شاہ صاحب بہت نفرت فرماتے تھے! اس موضوع پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اور اس کے ذیل میں بہت سی چیزیں آتی ہیں۔ بولنے والے کی نفسیات، سننے والے کی نفسیات، موضوع جس پر ہم گفتگو کر رہے ہیں، وہ پیرایۂ بیان جس کو ہم نے گفتگو کرنے کے لئے اختیار کیا، وہ خیالات جو ہم منتقل کرنا چاہتے ہیں اور پھر خطابت جس کے کئی شعبے ہیں۔ جس کی کئی شاخیں ہیں۔ فصاحت ہے، بلاغت ہے، عبارت آرائی ہے، خیال آفرینی ہے، بذلہ سنجی ہے، نکتہ آرائی اور نکتہ آفرینی ہے، کمیونیکیشن کے بہت سے شعبے ہیں اور بہت سے پہلو ہیں۔ جس سے آج کی علمی دنیا آباد ہو رہی ہے۔ ہمارے تعلیمی نصابوں میں یہ مضمون زیادہ مروّج نہیں، اس کی ایک شاخ ابلاغِ عامہ پڑھائی جاتی ہے۔ اور اسے عام طور پر صحافت سے متعلق سمجھا جاتا ہے۔ عوام الناس سے گفتگو کرنا ہو اور اپنی بات عوام الناس تک پہنچانا ہو تو کیسے پہنچائی جائے۔ ابلاغ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کے بغیر انسانی زندگی کی کوئی عمارت، کوئی ڈھانچہ کھڑا نہیں ہو سکتا۔ ہماری پوری زندگی کا دارومدار، پوری زندگی کی سرگرمیوں کا انحصار الفاظ کے ذریعے ابلاغ پر ہے۔ خواہ تقریر یا گفتگو کی صورت میں ہو خواہ تحریر کی صورت میں۔ اور الفاظ کے اتنے بے شمار پہلو ہیں، اس کی اتنی نزاکتیں ہیں، اس میں حسن کے، معنی آفرینی کے، اتنے پہلو ہیں کہ یہ بذاتِ خود ایک الگ مبحث، ایک الگ موضوعِ گفتگو ہے۔

شاہ صاحب کی خطابت کو ہماری درسگاہوں کے نصابوں کا حصہ ہونا چاہیئے تھا۔ دنیا کے علماء بلاغت نے اور آج کے ائمہ علمِ خطابت نے جو معیار مقرر کئے ہیں، جو پیمانے دیئے ہیں، اظہارِ خیال کو جانچنے کے۔ شاہ صاحب کی خطابت صرف یہی نہیں کہ ان پر پوری اترتی ہے بلکہ ان سب پیمانوں اور معیاروں سے ماورا کچھ اور بھی ہے:

یار ما ایں دارد و آں نیز ہم

یعنی اگر شاہ صاحب کی خطابت کو سامنے رکھ کر نصاب مرتب کیا جائے ابلاغ کا، جو آج کی یونیورسٹیوں میں پڑھایا جاتا ہے تو بہت سی خصوصیات خطابت کا اضافہ کرنا پڑے گا۔ اور بہت سے نئے پہلو سامنے لانا پڑیں گے۔ اس لئے کہ شاہ صاحب ان خطیبوں میں سے نہیں جو الفاظ کو پکڑ کر زبردستی لاتے ہیں۔ اردو کے ایک شاعر کے بارے میں کہا جاتا رہا ہے کہ زبان ان کے گھر کی لونڈی ہے، محاورے ان کے غلام ہیں، اور الفاظ ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ یہ بات میں نے کئی بار سنی اور ایک بار مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے کہا تبھی وہ الفاظ کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو قبلِ اسلام کے زمانہ میں غلاموں، کنیزوں اور لونڈیوں کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ آپ خطیبوں، ادیبوں، شاعروں، مقرروں کی گفتگو کو سنیں تو بعض اوقات محسوس ہوتا ہے کہ الفاظ کو مجبور کیا گیا ہے کہ "آیئے" اور منت کی گئی ہے کہ "تشریف لایئے"! عبارتوں میں، فقروں میں،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جملوں میں، الفاظ مجروح نظر آئیں گے۔ کسی کا ہاتھ ٹوٹا ہو گا، کسی کی گردن مڑی ہوئی ہو گی یا ہونگے صحیح الفاظ لیکن وہ الفاظ زندہ نہیں ہونگے۔ شاہ صاحب جس لفظ کو چھو لیتے تھے یوں لگتا تھا کہ اس میں روشنی کی کرن دوڑ گئی ہے۔ وہ بولتے تھے تو الفاظ ہمیشہ کے لئے تابندہ ہو جاتے تھے۔ جیسے مولانا ابوالکلام آزاد کا انتخاب شاعری ہمیشہ کے لئے زندہ ہو گیا ہے۔ اسی طرح حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ کا ذخیرۂ الفاظ تقریروں میں زندہ ہو گیا ہے۔ کاش! ان کے خطابات عالیہ محفوظ ہوتے! یہ بہت بڑی محرومی ہے کہ شاہ صاحب کی تقریریں محفوظ نہیں ہیں۔ بہت بڑا حادثہ ہے۔ میرے محترم دوست جناب خالد شبیر صاحب فرما رہے تھے کہ وہ شاہ صاحب کی تقریریں مرتب فرما رہے ہیں۔ خدا انہیں اس کام کی توفیق عطاء فرمائے۔ لیکن وہ کیفیت، وہ جاہ و جلال، الفاظ کا وہ نزول، کہاں سے لائیں۔ شاہ صاحب کی خطابت تو سننے اور دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

خطابت میں دنیا کی دو قوموں نے عروج حاصل کیا، یونانیوں نے اور انہی کے ساتھ رومیوں نے بھی۔ تہذیبی اعتبار سے روم نے یونان سے اتنا کچھ سیکھا ہے کہ بظاہر یونان اور روم ایک ہی ہیں۔ یونان اور روم وہ ہیں جن کی دریوزہ گری سے آج بھی مغرب کو عار نہیں ہے اور ان کی بات کو سند بناتا ہے اور ان کی ہر چیز کو افضل اور اعلیٰ سمجھتا ہے، بہر حال یونانیوں اور رومیوں نے بہت امتیاز حاصل کیا۔ ڈھائی ہزار سال پہلے کی بات ہے مگر ان کی خطابت آج بھی محفوظ ہے۔ سسرو(۱) کی تقریریں محفوظ ہیں۔ ایک اور یونانی ہوا ہے ڈیماس تھنیز(۲) اسکی تقریریں محفوظ ہیں۔ ایک تو خطابت میں یونانیوں اور رومیوں نے نام حاصل کیا اور دوسرے اہل عرب نے، عربوں کی فصاحت اور ان کی بلاغت ہمیشہ سے شہرہ آفاق رہی ہے۔ حضرت گرامی! بلاغت یہ ہے کہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مطالب کو بیان کیا جائے، عربوں ہی کا قول ہے:

۱۔ سسرو: (CICERO) ۱۰۲ تا ۴۳ قبل مسیح۔ یونان کا خطیب اور سیاستدان۔ ادب، فلسفہ، خطابت اور قانون میں تعلیم حاصل کی۔ وکالت کو بطور پیشہ اختیار کیا۔ اسے روم کا لائق ترین خطیب تصور کیا جاتا تھا۔ بالخصوص وکیل صفائی کی حیثیت سے اس کی حیثیت بے مثال تھی۔ ۵۸ ق م میں سیاسی وجوہ کی بناء پر اسے روم سے جلاوطن کر دیا گیا۔ تاہم ایک سال بعد وہ وطن واپس آ گیا۔ اس کی بہت سی تاریخی تقریریں محفوظ ہیں۔ اس کے بے شمار خطوط بھی رومن ادب کا حصہ ہیں۔ اس کی تقریروں کو اثر انگیز ہونے کے ساتھ ساتھ فکر انگیز بھی تصور کیا گیا ہے۔ سسرو نے اپنی تقریروں میں مجموعی طور پر استدلال اور اثر آفرینی کے مقاصد کو سامنے رکھا۔

۲۔ ڈیماس تھینیز (DEMOSTHENES) ۳۸۴ تا ۳۲۲ قبل مسیح کے زمانے کا یونانی خطیب جسے فن خطابت اور سیاسی بصیرت کی وجہ سے ناموری حاصل ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ بچپن میں وہ لکنت کا شکار تھا۔ لیکن اسے مقرر بننے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ چنانچہ وہ اپنے منہ میں کنکریاں بھر کر (گویا زبانِ الکن کی تادیب کرتے ہوئے) سمندر کے کنارے چلا جاتا تھا اور پرشور لہروں سے خطاب کرتا تھا۔ اسی طرح وہ اسی حالت میں تقریر کرتے ہوئے پہاڑوں پر چڑھتا تھا بالآخر اسے یونان میں ایک عظیم مقرر تسلیم کر لیا گیا۔ سیاسی انتقام و خوف سے اس نے زہر کھا کر خودکشی کی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خیرالکلام ماقل ودل تقلیلِ کلام بلا تقصیرِ معانی، بلاغت کا اصل جوہر ہے۔ وقت کم ہو بات زیادہ ہو لیکن اس طرح سے ہو کہ کوئی چیز کم نہ ہو جائے۔ اہلِ عرب کی فصاحت و بلاغت کا کوئی جواب نہ تھا۔ اب بھی نہیں ہے بربنائے عقیدت نہیں کہتا، بلکہ حقیقت ہے کہ عربی زبان، اسکی فصاحت و بلاغت اس کے بیان کے پیرائے، اسکا ذخیرۂ الفاظ سب کے سب آج بھی غیر معمولی ہیں۔ اس غیر معمولی زبان کے ذخیرے میں جو لوگ امتیاز حاصل کرتے تھے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ کیا ہوں گے۔ علمی اعتبار سے بیان کی صلاحیت اصل ہے اور خطابت اس کی فرع یا ترقی یافتہ صورت ہے۔ کلام کرنے یا بیان کرنے کی صلاحیت انسان کی سب سے بڑی صفت ہے۔ جس میں تمام انسان تلامیذ الرحمٰن ہیں۔ آپ حیران تو ہوں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ حسنِ بیان میں تمام نوعِ انسانی ذاتِ باری تعالیٰ کی شاگرد ہے۔ شرفِ انسانیت اس وقت ظاہر ہوا جب ذاتِ باری تعالیٰ نے حضرت آدم کو جملہ اشیائے عالم کے اسماء سکھائے، اور فرشتوں کو سنوائے، گویا زبان اپنی اصل میں تسمیہ کا عمل ہے۔ اختصار کے ساتھ عرض کروں کہ زبان چیزوں کو نام دینے کا عمل ہے۔ سورہ الرحمٰن کی پہلی آیت ہے

الرحمٰن علم القرآن

رحمٰن وہ ہے جس نے قرآن کی تعلیم دی۔ گویا بالاستعداد یا بالقوی سب انسانوں کو قرآن کی تعلیم دی جاچکی، یہ ان کی جبلت میں ہے۔ قرآن فہمی کسی انسان کی جبلی استعداد سے باہر نہیں پھر ارشاد ہوا کہ:

خلق الانسان علم البیان

کہ انسان کو پیدا کیا اور اس کو بیان سکھایا تو بیان کی صفت سراسر انسان کا امتیاز ہے۔ اسی لئے میری رائے میں جو گروہ، جو فرد، اس صلاحیت بیان میں خصوصی امتیاز رکھتا ہے وہ اس معاملے میں خاص طور پر منعم علیہ ہے۔

میں عرض کر رہا تھا کہ اہلِ عرب کو فصاحت و بلاغت میں اختصاص و امتیاز حاصل تھا۔ یہی ان کا سرمایۂ افتخار تھا۔ وہ خود کو گویا اور دنیا کی دوسری اقوام کو اپنے مقابلے میں گونگا تصور کرتے تھے۔ زبان آوری اور عرب ہم معنی ہو گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ لغت میں لفظ "عرب" کے ایک معنی فصیح البیان کے بھی ہیں۔ عربی زبان کی ساخت ایسی ہے کہ بلاغت اس کا عنصری جوہر ہے۔ خیال رہے کہ بلاغت کے اصطلاحی معنی کلام کا ہر نوع کے ابہام سے پاک ہونا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم میں "عربی مبین" کے الفاظ آتے ہیں۔ ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے قرآن کو عربی مبین میں نازل کیا ہے۔ اب اگر عربی مبین خود عربی زبان کی خوبی ہے تو بھی اور اگر اس سے مراد عربی کا وہ خاص اسلوب یا لہجہ ہے جس میں قرآن کریم نازل کیا گیا تو بھی، وضاحت، صراحت، بلاغت عربی کی فطری خصوصیات قرار پاتی ہیں۔ ان خصوصیات کا اظہار عربوں میں نظم اور نثر دونوں میں ہوتا تھا۔ شاعری اور خطابت ان کی گھٹی میں پڑی تھیں۔ جب اس میں توحید و رسالت کی تعلیم اور فریضۂ تبلیغ کا اضافہ ہوا تو اہلِ عرب کی فصاحت و بلاغت دو دھاری تلوار بن گئی۔ اور خطاب مفصول ایک طرح سے مسلمانوں کی تہذیبی خصوصیت قرار پائی۔ مسلمانوں نے علم بیان میں کسی دوسری قوم سے کسب فیض

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں کیا۔ فنونِ خطابت کی علمی تشریح میں وہ یونانیوں اور رومیوں کو پیچھے چھوڑ گئے۔ اس کے بعد اب تک دنیا کی کوئی اور قوم خطابت اور حسنِ بیان کو اعجاز کے مرتبے تک نہیں پہنچا سکی۔ غرض خطابت مسلمانوں کا تہذیبی ورثہ ہے۔ اور ابلاغ صداقت میں ان کی شمشیر بے نیام بھی! لیکن شمشیر بے نیام زیور سے زیادہ ذمہ داری ہے۔ اس لئے ہم نے ایک مدت سے "معجز بیانی" سے زیادہ "جادو بیانی" کو سینے سے لگا رکھا ہے۔ اس لئے کہ جادو بیانی لطافتِ احساس اور ذوقِ جمال کی تسکین کرتی ہے۔ اور ذوقِ عمل کو سلائے رکھتی ہے۔

حسنِ بیان کا جادو اس لئے نہیں ہے کہ لوگوں کا دل لبھایا جائے۔ ان کو سلایا جائے، ان پر نیند طاری کر دی جائے۔ ایسے بھی خطیب اور ایسے بھی ادیب ہیں، ایسے بھی جادو بیان مقرر، جادو نگار ادیب ہیں جو نیند طاری کر دیتے اور نیند طاری کرنے کو کمالِ فن سمجھتے ہیں۔ اور اسی کی انہیں داد ملتی ہے۔ کہ فلاں تو ہپناٹائز کر دیتا ہے۔ لیکن یہ فصل الخطاب نہیں فصل الخطاب نیک اور بد کا پارکھ اور حق و باطل کا فارق ہوتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام میں یہ فضیلت حضرت داؤد علیہ السلام کو بخشی گئی کہ انہیں استحکام سلطنت اور علم و حکمت کے ساتھ ساتھ فصل الخطاب بھی عطا کیا گیا۔ سورہ ص میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

وشددنا ملكه واتينه الحكمة وفصل الخطاب

مفسرین نے "فصل الخطاب" سے مراد تقریر اور خطابت کے فن میں کمال لیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا خطاب فصاحت و بلاغت اور شوکت و سلاست کا جامع ہوا کرتا تھا۔ چونکہ فصل کے معنی الگ کرنے اور واضح طور پر الگ کر کے دکھانے کے ہیں۔ اس لئے فصل الخطاب سے مراد ایسا بیان اور تقریر ہے جو فیصلہ کن ہو اور حق و باطل میں واضح طور پر تفریق کرنے والا ہو۔ فصل الخطاب وہ بیان ہے جو فصیح اور بلیغ ہونے کے ساتھ ساتھ فیصلہ کن بھی ہو۔ ان معنوں میں کہ حسنِ بیان کے ساتھ غلط اور صحیح، حق اور باطل میں بھی تفریق کرتا چلا جائے۔ انبیاء علیہم السلام چونکہ اپنی ہر بات میں، اپنے ہر قول و فعل میں حق اور باطل میں امتیاز قائم کرتے رہے ہیں اس لئے فصل الخطاب کی خوبی ان تمام برگزیدہ ہستیوں کے کلام کا جوہر ہوگی۔ لیکن چونکہ حضرت داؤد علیہ السلام کو اس صفت میں خصوصی امتیاز حاصل تھا اس لئے قرآنِ کریم میں اس کا خاص طور پر ذکر فرمایا گیا ہے۔ ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم عربوں کے فصیح ترین قبیلے میں پیدا ہوئے۔ آپ کی فصاحت و بلاغت کی شان یہ تھی کہ اس وصف کو آپ ﷺ نے اپنے ان فضائل میں شمار کیا جن کی بدولت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسرے انبیاء علیہم السلام پر فضیلت حاصل ہوئی۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے جس کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے انبیائے پیشین پر چھ باتوں میں فضیلت دی گئی مجھے کلماتِ جامعہ عطا کئے گئے: اعطيت جوامع الكلم

مجھے نصرت بالرعب عطا کی گئی میرے لئے مالِ غنیمت حلال کیا گیا۔ روئے زمین کو میرے لئے مسجد اور سبب طہارت بنا دیا گیا۔ مجھے تمام مخلوق کے لئے رسول بنایا گیا۔ اور میری ذات پر انبیاء اور مرسلین کے سلسلے کو ختم کر دیا گیا۔ لغوی طور پر جوامع الکلم سے مراد ایسے کلمات ہیں جو جامع ہوں، لیکن خود جامع کلمات سے مراد کیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔ اس سوال کا جواب علامہ سلمان منصور پوری کے الفاظ میں ہے: "سادہ صاف الفاظ، شستہ تراکیب، مختصر عبارت میں ایسے معانیٔ عالیہ کو بھر دینا جو عمیق بھی ہوں اور دقیق بھی۔ داخلِ کمالِ فصاحت ہے" (۱) فصاحت و بلاغت کا یہ وصف نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متبعین و محبین کو بھی بقدر ظرف و بقدر حوصلہ عطا فرمایا گیا ہے۔ اس وصف خاص میں جتنا جس کا حصّہ ہے اتنا ہی وہ ذی شان ہے۔

مختصر بات یہ ہے کہ اگر یونانیوں اور رومیوں کو اتحاد تمدن و ثقافت کے باعث ایک قوم فرض کر لیا جائے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تاریخ عالم میں خطابت کے اعتبار سے دو ہی قومیں ممتاز نظر آتی ہیں۔ یونانی و رومی اور عربی و حجازی! دنیا کے دوسرے فنون کی تاریخیں لکھی گئی ہیں لیکن خطابت کی تاریخ میرے علم کے مطابق آج تک نہیں لکھی گئی۔ خطابت کے فن پر یقیناً مشرق و مغرب میں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن تاریخ نہیں لکھی گئی۔ خطابت مسلمانوں کا تہذیبی اور دینی ورثہ ہے۔ لیکن ادھر بھی اس سلسلے میں کوئی قابلِ ذکر کام نہیں کیا گیا۔ کسی کو فرصت ہو تو دیکھے کہ ہمارے ادب میں فصاحت و بلاغت کے کیسے کیسے جوہر ریزے چشم بینا اور ذوقِ نظر کے منتظر ہیں۔ اس سلسلے میں محرومی کا ایک خاص سبب عربی زبان سے عمومی ناواقفیت ہے۔ جو ہمارے جدید اربابِ دانش کے لئے حجاب اکبر بنی ہوئی ہے۔ اگر مسلمان خطیبوں کے خطبے اور تقریریں جمع کی جائیں تو جلدیں مرتب ہو سکتی ہیں۔ ازمنۂ رفتہ کو چھوڑتے ہوئے جن مسلمان مفکروں اور رہنماؤں کا نام خطابت میں بلند ہوا ان میں سرفہرست اور سب سے اہم نام امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری علیہ الرحمہ کا ہے۔ جن کی یاد میں آج ہم یہاں جمع ہیں۔ دین اسلام سے ان کی سچی اور گہری وابستگی اور ان کے حسنِ بیان کی حسن آفرینی اور اثر انگیزی کو دیکھتے ہوئے ظفر علی خان نے میر انیس کے مصرعہ پر کیسی برمحل اور معنی خیز تضمین کی ہے:

کانوں میں گونجتے ہیں بخاری کے زمزمے
بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں ۲؎

بیسویں صدی میں قدرت نے اہل اسلام کو اور بھی کئی سحر بیان اور بلیغ اللسان خطیب عطا کئے ہیں۔ اور یہ بات میں ایک طالب علم کی حیثیت سے عرض کر رہا ہوں۔ اور بھی قابل احترام اور قابلِ قدر نام ہیں

۱۔ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری: رحمتہ للعالمین۔ حصہ سوئم۔ طبع لاہور۔ ص۔ ۱۸۲

۲؎ معنویت کے اعتبار سے میر انیس کا پورا بند قابلِ توجہ ہے:

یہ حسن صوت اور قراءت، یہ شد و مد حقا کہ افصح الفصحا ہے انہی کا جد
گویا ہے لحن حضرت داؤد با خرد یارب رکھ اس صدا کو زمانے میں تا ابد
شعبے صدا میں، پنکھڑیاں جیسے پھول میں
بلبل چہک رہا ہے ریاض رسول میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہادر یار جنگ ہیں(۳)، مولانا ابوالکلام آزاد ہیں(۴) یہ تو بے حد ممتاز نام ہیں اور تاریخ کا حصہ ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی نامور لوگ ہیں۔ جن کے دوسرے کارنامے ان کے حسن تقریر پر غالب آگئے۔ وگرنہ دنیا نے

ان کی جادو بیانی کا لوہا مانا لیکن تمام معاصر شہادتیں اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ کو ان سب میں امتیاز بدرجۂ اعجاز حاصل تھا۔ میں نے ذاتی طور پر نہ بہادر یار جنگ کو سنا ہے نہ مولانا آزاد علیہ الرحمہ کو، ان حضرات کی خوبیاں سنی ہیں۔ اور علم اور ادب سے تعلق رکھنے والے کچھ اور معجز بیانوں کے خطبات بھی سنے ہیں۔ اس لئے کہہ سکتا ہوں کہ خطابت کی تحسین کے لئے ایک ذوقی میلان اور ایک وجدانی اذعان ضرور رکھتا ہوں۔ اگرچہ میں نے شاہ صاحب کو اس وقت سنا جب مجھے ابھی سننے کے آداب سے بھی آگاہی نہیں تھی۔ لیکن ان لوگوں میں سے ضرور ہوں جن کا ادعا ہے کہ انہوں نے شاہ صاحب کو سنا ہے۔ بچپن ہی میں سہی تاہم میں نے شاہ صاحب کی چند تقریریں سنی ہیں۔ حافظے کی دوری پر ہی سہی۔ تاہم اس اعجاز بیان کی کچھ یادیں لوح ذہن پر نقش و مرتسم ضرور ہیں۔ مجھے وہ آواز، وہ لحن، وہ آہنگ کسی حد تک ضرور یاد ہے۔ جو سماعت اور بصارت دونوں کو یکساں متاثر کرتا تھا۔ مجھے اجازت دی جائے کہ میں کچھ ادھوری اور ناقص تمثیلوں سے کام

۳۔ افسوس کہ بہادر یار جنگ کے خطبات بھی محفوظ نہیں کئے جاسکے۔ جو کچھ ریکارڈ ہوا ہے اس کو سن کر ان کی خطابت کی تمام خوبیاں ابھر کر سامنے نہیں آتیں۔ تاہم اس سے ان کی آواز اور لب و لہجہ کا کسی حد تک اندازہ ضرور کیا جاسکتا ہے۔ ریکارڈ شدہ تقریر کے حوالے سے کہا جاسکتا ہے کہ ان کی آواز پاٹ دار اور کسی قدر تیز تھی اور وہ بہت حد تک یکساں لہجے میں تسلسل کے ساتھ تقریر کرتے تھے۔ لیکن یہ ان کی خطابت کا ایک ادھورا سا خاکہ ہے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے وہ لطائف و ظرائف سے بہت کم کام لیتے تھے۔ البتہ شعر (زیادہ تر اقبال کے) کثرت سے استعمال کرتے تھے۔ مجموعی طور پر ان کا لب و لہجہ ایک پرجوش اور رواں دواں تقریر کرنے والے کا سا تھا!

۴۔ مولانا ابوالکلام آزاد بھی بلاشبہ ایک عظیم خطیب تصور کئے گئے ہیں۔ ان کے بعض خطبے تحریری صورت میں ضرور محفوظ ہیں۔ لیکن ان کی کچھ تقریریں صدا بند کی جاسکیں یا نہیں اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ چونکہ ان کی تحریر اور تقریر میں زیادہ فرق نہیں تھا اس لئے ان کے انداز خطابت کے بارے میں کسی حد تک ان کی تحریروں کی مدد سے ایک قیاسی تاثر ضرور قائم کیا جاسکتا ہے۔ اگر "الہلال" اور "البلاغ" کے بعض اداریوں اور خصوصی شذروں کو ان کی تقریروں کا قائم مقام فرض کر لیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ اگرچہ بنیادی طور پر ان کی خطابت کا انداز عالمانہ تھا تاہم وہ ایک پرجوش اور اثر انگیز خطیب تھے۔ ان کی تقریروں میں اثر آفرینی اور جذبات میں تحریک پیدا کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم تھی۔ عالمانہ آہنگ میں ایک گرج، ایک گونج اور ایک شکوہ تھا جو رفعت خیال کے ساتھ ساتھ شدت جذبات کو بھی ظاہر کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے خطیبانہ آہنگ سے سامعین کو سحر زدہ کر دیتے تھے۔ اُن کی تحریروں میں خطابت کے بعض بہترین اجزاء اُن کے اسلوبِ خاص کا حصہ بن کر ابھرتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لوں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ ایک ستارہ چمکتا ہے، ٹوٹتا ہے اور اپنے پیچھے لکیر سی چھوڑ جاتا ہے۔ جتنی تیزی سے وہ لکیر ابھرتی ہے اتنی تیزی سے غائب ہو جاتی ہے۔ یہ بھی روشنی ہے۔ ایک روشنی یہ ہے کہ بجلی چمکی اور سب کچھ روشن ہو گیا ایک لمحے کے لئے، ایک ثانیے کے لے، یہ بھی ایک روشنی ہے لیکن روشنی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ تصور کیجئے کہ اگر یہاں ایک افق سے دوسرے افق تک بیک وقت کئی چاند زمین کے قریب آجائیں وہ کس طرح کی روشنی ہو گی۔ اس طرح کی روشنی سے ہم سب منور ہوں گے۔ سب کے چہرے چمک اٹھیں گے، سب کی آنکھوں میں روشنی ہو گی، شاہ صاحب کی خطابت ایسی ہی روشنی تھی جس سے چشم و بصیرت، فکر و نظر، قلب و جگر سب روشن ہو جاتے تھے۔ جب وہ خطاب فرماتے تھے تو فضا ان کے لحن سے، ان کے ارتعاشات سے لبریز ہو جاتی تھی۔ چھلک، چھلک جاتی تھی۔ مغرب کی تنقیدی اصطلاحات کے حوالے سے شاہ صاحب علیہ الرحمہ کی جلالت مآب خطابت کے لئے مجھے سبلائم (SUBLIME) کا لفظ موزوں ترین دکھائی دیتا ہے۔ یہ ایک رومن نقاد لائن جائی نس کی اصطلاح ہے۔ اور اتفاق سے اس نے اس کا اطلاق خطابت ہی پر کیا ہے۔ اس اصطلاح کا اطلاق جمال کی ایسی انواع پر ہوتا ہے جن میں جلال اور شکوہ کا عنصر نمایاں ہو۔ ہمارے ہاں اردو میں اس اصطلاح کا ترجمہ ارفع اور جلیل کے الفاظ سے کیا گیا ہے۔ جلیل اور ارفع "سب لائم" (SUBLIME) ہے۔ جتنی عظیم الشان چیزیں ہیں وہ سب "سب لائم" ہیں۔ ارفع ہیں، صرف خوبصورت نہیں جلیل ہیں، ارفع ہیں اور جمال ان میں شامل ہے۔ جیسے آپ بادشاہی مسجد کو دیکھتے ہیں یہ جلیل ہے جلالت مآب ہے۔ اس کے سامنے پہنچ کر اپنے اندر ایک ارفعیت کا احساس ہوتا ہے۔ میں ایک بات خاص طور پر یہاں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کچھ عظیم چیزیں وہ ہیں کہ جب ہم ان کے سامنے جاتے ہیں تو ہم بہت حقیر ہو جاتے ہیں۔ سمندر کے کنارے ہم کھڑے ہو کر اپنے آپ کو اس بے کراں حقیقت کے مقابلے میں بہت چھوٹا محسوس کرتے ہیں۔ ایک بہت مہیب اور خوفناک خشک پہاڑ، سنگلاخ پہاڑ کے سامنے یا اس کے نیچے کھڑے ہو کر ہم اپنے آپ کو بہت چھوٹا پاتے ہیں یہ بھی ایک عظمت کا پہلو ہے۔ جلالت و عظمت کی یہ بھی ایک قسم ہے۔ لیکن جلیل وہ ہے اور ارفع وہ ہے جو اپنی جلالتہ و رفعتہ میں جمال کا پہلو نمایاں طور پر رکھتا ہے۔ اور ناظرین کو بھی اس میں شامل کر لیتا ہے۔ اس کے ناظر و شاہد بھی اپنے اندر ارفعیت کا احساس پاتے ہیں۔ یعنی جب ہم اسے دیکھتے ہیں تو ہم اپنے آپ کو اس عظمت کا شریک محسوس کرتے ہیں۔ ہم میں بھی وہ رفعت پیدا ہوتی ہے۔ وہی انبساط و انشراح پیدا ہوتا ہے۔ شاہ صاحب کی خطابت، ان کی شخصیت، اور ان کا کردار بعینہ ایسا ہی تھا جو بھی ان کے روبرو جاتا تھا محسوس کرتا تھا کہ میں بھی عظیم ہوں، میں بھی صاحبِ کردار ہوں، میرے اندر بھی کوئی استعداد موجود ہے۔ وہ ہم سب کو اپنی عظمت میں شریک کر لیتے تھے۔ اپنی بے پایاں محبت کے ذریعے، اپنے حسنِ سلوک کے ذریعے! ارفعیت (SUBLIMITY) کے ------ اولیں شارح یا بانی لان جائی نس (LONGINUS) نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ شاعری ہو یا خطابت، کلام میں رفعت اور بلندی صرف اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب ان کا سرچشمہ رفیع اور بلند ہو جس شخصیت کے باطن سے خیالات ابھر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رہے ہیں وہ خود عظیم اور رفیع ہو- اس مفروضے کی صداقت کا ثبوت شاہ صاحب علیہ الرحمہ کی خطابت سے ملتا ہے- انکی خطابت اس لئے عظیم تھی کہ ان کی روح عظیم تھی- ان کا باطن رفعت خیال کا سرچشمہ تھا- ان کا جذبۂ حریت بے کراں تھا- اس لئے ان کی خطابت میں سمندروں کا خروش ہی نہیں، آبشاروں کا ترنم بھی تھا- دریاؤں کی روانی ہی نہیں، چشموں کی ٹھنڈی میٹھی رِل ترل بھی تھی- ان کے ہاں نغمۂ جبریل اور صور اسرافیل مل کر ایک ہو گئے تھے- سسرو ہو یا ڈیما ستھنیز، میکالے ہو یا کوئی اور مغربی خطیب، ان کے کمالِ خطابت کا انحصار زیادہ تر سفسطہ پر ہے- یعنی لفظی ہیر پھیر اور منطقی مغالطے جس کا مطلب تھا کہ بات چاہے غلط ہو چاہے صحیح ہو اسے آپ ثابت کر کے ہی دم لیں گے- سفسطے کی ایک مثال میں آپ سے عرض کرتا ہوں مثلاً میں اس طرح کا استدلال کرتا ہوں کہ میرا ہاتھ میز کو چھو رہا ہے- میز زمین کو چھو رہی ہے- اس لئے میرا ہاتھ زمین کو چھو رہا ہے- بظاہر میں نے اس میں استدلال کے تقاضے پورے کئے ہیں- صغریٰ کبریٰ اور حدِ اوسط موجود ہیں لیکن میرا استدلال صریحاً غلط اور مغالطہ آفریں ہے اس لئے کہ میں نے غلطی سے یا جان بوجھ کر اس میں ایک مغالطہ پیدا کر دیا ہے- وہ یہ کہ میں نے اپنے ہاتھ اور میز کو ایک دوسرے کا عین قرار دے دیا ہے- جو کہ بالبداہت غلط ہے- میرا ہاتھ میز کا عین نہیں ہے- نہ میز میرے ہاتھ کی عین ہے کہ ایک کا فعل دوسرے کے فعل کے عین مترادف قرار پائے- اس استدلال کی غلطی اتنی واضح ہے کہ فوراً سمجھ آجاتی ہے لیکن بعض استدلال دقیق اور پیچیدہ ہوتے ہیں کہ ان میں چھپے ہوئے مغالطوں تک عام طور پر آسانی سے رسائی نہیں ہوتی ایسے مغالطوں سے جان بوجھ کر کام لینے والا سوفسطائی کہلاتا ہے- جس کا دعویٰ ہوتا ہے کہ وہ دلائل کے زور سے ہر بات کو سچ ثابت کر سکتا ہے-

یہ استدلال تھا ان کا جسے ہم منطقی مغالطہ کہتے ہیں- سسرو اور ڈیماس تھینز کی خطابت اقدارِ اعلیٰ کے لئے نہیں تھی- خیال فرمایئے، ان کا خطاب اقدارِ اعلیٰ کے لئے، حقیقت کے لئے، سچائی کے لئے نہیں تھا اس کے پیچھے کردار کی قوت نہیں تھی- اس کے پیچھے زندگی کا، کائنات کا کوئی ادراک کوئی تصور، کوئی وژن موجود نہیں تھا، کوئی نقطۂ نظر نہیں تھا، کوئی فلسفہ نہیں تھا، وہ صرف لفظی ہیر پھیر تھا- محض سفسطہ تھا، خیال نہیں، بلکہ فریب خیال، حقیقت نہیں، بلکہ فریب حقیقت! لیکن شاہ صاحب کی خطابت کے پیچھے ایک پوری روایت تھی- علوم کی بھی، تہذیب کی بھی، خطابت کی بھی اس لئے شاہ صاحب کی تقریر میں یہ اثر تھا جو آپ لوگ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں اور جس کے شواہد تاریخ کا حصہ ہیں کہ جو بات وہ بیان فرماتے تھے وہ دل میں اترتی چلی جاتی تھی- وہی شعر صادق آتا ہے:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ان کی خطابت کے بارے میں میں یہاں کہوں گا کہ وہ دلوں سے "کمیونیکیٹ" کرتے تھے کہ ان کا ابلاغ دلوں تک تھا- جہاں وہ جذبات اور احساسات کی تاروں میں لرزش پیدا کرتے تھے، وہ عقل و دانش سے بھی خطاب فرماتے تھے- عقل اور عشق دونوں ان کے مخاطب بھی تھے اور دونوں مقصود بھی! تاہم مجموعی طور پر ان کا طرز

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

استدلال صرف طرزِ استدلال نہیں بلکہ حسنِ استدلال تھا۔ جسے صرف عشق انگیز کہا جا سکتا ہے۔ وہ بولتے تھے تو لفظ زندہ ہو جاتے تھے۔ جذبوں کی کہکشائیں روشن ہو جاتی تھیں۔ دلوں میں دنیائیں جگمگا اٹھتی تھیں۔

حضرات گرامی! جیسا میں نے شروع میں کہا تھا میں نہ مقرر ہوں نہ خطیب، میرے دوست ابنِ امیر شریعت حضرت مولانا عطاء المحسن بخاری کو میرے بارے میں جو حسنِ ظن ہے صرف اسی کی بناء پر میں یہاں حاضر ہوا اور چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ نذر کئے۔ اجازت چاہتا ہوں۔ والسلام! (۲۱ اگست ۱۹۸۰ء)

استدراک

آج سے کئی سال پہلے ارتجالاً کہی ہوئی یہ چند باتیں احباب کی قدر افزائی کی بدولت ریکارڈ ہو گئی تھیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان بکھری بکھری باتوں کی قیمت ممدوح کی علوِ شان نے بڑھائی ہے۔ وگرنہ یہ گفتارِ پریشاں شاید اس قابل نہ ہوتی کہ اسے طباعت کے سپرد کیا جاتا۔ تقریر و تحریر کے قدرتی اور لازمی فرق کے پیشِ نظر سطور بالا پر نظرِ ثانی ناگزیر تھی۔ چنانچہ مسطورہ بالا گفتگو کو قابلِ مطالعہ بنانے کے لئے کسی قدر حک و اضافہ کیا گیا ہے لیکن اسے اساساً تبدیل نہیں کیا گیا۔ بعض حوالوں پر حواشی کا اضافہ کیا گیا ہے تاکہ فنِ خطابت کے تاریخی تناظر کے بارے میں کچھ اشارات فراہم کئے جا سکیں۔ لیکن نظرِ ثانی کے ساتھ ہی اس احساس سے بھی دوچار ہونا پڑا کہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے وہ شاید نہیں کہا جا سکا۔ شاہ صاحب علیہ الرحمہ کی تقریروں کے متون کی عدم دستیابی کی وجہ سے ایک مکمل اور بھرپور فنی جائزہ تقریباً ناممکنات میں سے ہے۔ اس لئے اس معاملے میں ہر کوشش خراجِ تحسین اور نذرانۂ عقیدت سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ شاہ صاحب کے وہ نیازمند اور عقیدت گزار جنہیں شاہ صاحب کو قریب سے دیکھنے اور ان کے حسنِ خطابت سے بہرہ اندوز ہونے کے مواقع زیادہ ملے اس منصب سے صحیح معنوں میں عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ میرے اجمالی تاثرات جن کی اساس بچپن کی دھندلی یادوں پر ہے فنی یا معروضی رائے کے سانچے میں نہیں ڈھل سکتے۔ تاہم میرے علم کی حد تک شاہ صاحب کے کمالِ خطابت کے فنی محاسن کا علمی اور معروضی جائزہ ابھی تک نہیں لیا گیا۔ شاہ صاحب کو عام طور پر ایک عوامی خطیب کے رنگ میں پیش کیا جاتا ہے جو اپنے سامعین کی نبضِ احساس پر ہاتھ رکھ کر ان کے جذبات کی ترجمانی کا حق ادا کرتا تھا۔ لیکن انہیں صرف ایک عوامی خطیب کہنا ان کے محاسن سے چشم پوشی کرنے یا ان سے بے خبر رہنے کا ثبوت دینا ہے۔ شاہ صاحب کی ہر تقریر علمی اور ادبی نکات سے مملو ہوتی تھی۔ وہ اقبال اور ظفر علی خاں کی طرح پنجاب کی سرزمین کا فخر تھے۔ اور زبان و بیان پر بھی ویسی ہی قابلِ رشک قدرت رکھتے تھے قرآنی آیات، احادیث مبارکہ، اقوال و اشعار اور امثال و نظائر کا برمحل استعمال ان کے فنِ خطابت کے اولیں محاسن میں سے تھا۔ قرآنِ کریم کی تلاوت میں ان کا لحن، لحنِ داؤدی کے تصور کو مثال اور حقیقت بنا دیتا تھا۔ اسی طرح کبھی تحت اللفظ اور کبھی ترنم کے ساتھ اشعار کی ترتیل بھی ایک سماں پیدا کرتی تھی۔ ظرافت اور بذلہ سنجی میں وہ مثیل غالب تھے۔ حریف (انگریزی استعمار) پر فقرہ چست کرنے اور پھبتی کسنے میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ محاسنِ کلام اور صنائع بدائع میں کون سی صنعت تھی جس سے وہ کام نہیں لیتے تھے۔ تشبیہ،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

استعارہ، تمثیل، کنایہ، مجازِ مرسل، اور سب سے بڑھ کر تعریض ان کے بیان کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتے تھے۔ ان کا دل جذبۂ حریت سے لبریز اور ان کی ذات تمام تر عشقِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے سرشار تھی۔ پنجاب کے صوفی شعراء کے حوالوں اور بعض عوامی جملوں کے برمحل استعمال سے اثر انگیزی کے حیرت انگیز کرشمے دکھاتے تھے۔ ان کی اکثر یادگار تقاریر کا ایک "مرکزی نغمہ" (استعارۃً THEME SONG) ہوتا تھا۔ جس کی طرف وہ بار بار پلٹتے تھے۔ اور ہر بار نئی سے نئی نکتہ طرازی کرتے تھے۔ وہ سخن فہم، سخن سنج اور سخن ور تھے۔ زبان کے بے شمار اسالیب ان کے اسلوب خاص میں عناصر ترکیبی کا کام دیتے تھے۔ وہ اپنی بات کو کبھی صراحت سے، کبھی اشارت سے، کبھی مثال سے اور کبھی تمثال سے واضح کرتے تھے۔ زبان (LANGUAGE) ان کی زبان (TONGUE) پر آکر کبھی بولتی تھی کبھی گاتی تھی اور کبھی وجد میں آکر رقص کرتی تھی۔ وہ ظاہری عظمت اور ساختہ طمطراق کے باطن سے مضحک (RIDICULOUS) کو برآمد کر دکھاتے تھے اور کبھی ادنیٰ اور حقیر چیز سے عظمت کردار کا تصور وابستہ کر دکھاتے تھے۔ ان کا ایک مشہور جملہ کہ: "میں تو ان چیونٹیوں کو شکر کھلانے کے لئے تیار ہوں جو انگریز بہادر کو کاٹ کھائیں"۔ میرے اس خیال کی تائید کے لئے کافی ہے! وہ ایک وسیع المطالعہ، دقیق النظر، اور رفیع الفکر خطیب تھے۔ اردو زبان نے ان کے اندازِ خطابت میں نئے سے نئے امکانات کو دریافت کیا۔ وہ اپنی علمی جزالت اور بلندیٔ فکر کے باوجود عوام الناس کے بہت قریب رہتے تھے۔ ان کے بیشتر موضوعاتِ خطابت عوام الناس کی زندگیوں کے غائر مطالعے سے ابھرتے تھے۔ وہ ایک سچے شاعر کی طرح الفاظ سے خائف نہیں تھے۔ بلکہ الفاظ کی جوہری توانائی کو دریافت کرنے کے ماہر تھے۔ وہ خود الفاظ کو ان کی معنوی وسعتوں سے آشنا کرتے تھے۔ اور انہیں بولنا، گنگنانا اور زمزمہ پرداز ہونا سکھاتے تھے۔ وہ گلی کوچوں میں پھرنے والے عام لوگوں کے پرخلوص لہجوں کے قدردان تھے۔ محبت سے کہا ہوا کوئی بھی جملہ، خواہ کسی بھی زبان میں ہو، ان کے سمند خطابت کے لئے مہمیز بن جایا کرتا تھا۔ بعض لوگوں کو شاید اب بھی یاد ہو کہ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کی درگاہ کے مشرقی چبوترے اور ملحقہ صحنوں میں منعقد ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے ملتانی زبان کا ایک جملہ ("شالا چڑھی کمان ہووی") ان کی اس تقریر کا THEME SONG تھا۔ اسی طرح صوفیاء کے کلام کے معروف و مقبول اجزاء اور بعض اوقات عوامی "بولیوں" (پنجابی شاعری کی عوامی صنف) کے الفاظ پر جو بظاہر غیر ادبی، غیر فصیح یا پیش پا افتادہ دکھائی دیتے تھے وہ اپنے خطابات عالیہ کی بنیاد رکھتے تھے اور انہیں عوامی بنیادوں پر رفعت فکر، شکوہ بیان، ندرتِ خیال اور حسنِ کلام کی نادر الوقوع لفظی عمارات کھڑی کر دکھاتے تھے مغربی استعمار سے بالعموم اور فرنگی استعمار سے بالخصوص شدید نفرت کرنے والے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے کمال خطابت کے محاسن کا تجزیہ کرتے ہوئے دانش مغرب کی اصطلاحات اور "دانایانِ فرنگ" کے تصورات کا حوالہ دنیا شاید ستم ظریفی دکھائی دے۔ لیکن شاہ صاحب علیہ الرحمہ اس رسولِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کے والہ و شیدا تھے جس نے کلماتِ حکمت کو مؤمن کی گمشدہ میراث قرار دے کر ہر عہد کی اقلیم دانش کو مسلمان کی قلمرو بنا دیا ہے۔

© rasailojaraid.com